رکوعاتہا 3

44 سُوۡرَۃُ الدُّخَانِ مَکِّیَّۃٌ 64

آیاتہا 59

نام

آیت نمبر ۱۰، يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ کے لفظ دخان کو اس سورۃ کا عنوان بنایا گیا ہے، یعنی یہ وہ سورۃ ہے جس میں لفظ دخان وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول

اس کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہوتا، مگر مضامین کی اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ بھی اسی دور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۃ زُخْرُف اور اس سے پہلے کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں، البتہ یہ ان سے کچھ متأخر ہے۔ تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب کفار کی مخالفانہ روش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی (ﷺ) نے دعا کی کہ خدایا، یوسف (علیہ السلام) کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضور (ﷺ) کا خیال یہ تھا کہ جب ان لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انہیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بلبلا اٹھے۔ آخر کار بعض سرداران قریش، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے خاص طور پر ابو سفیان کا نام لیا ہے، حضور کے پاس آئے اور آپ سے درخواست کی کہ اپنی قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کے لیے اللہ سے دعا کریں۔ یہی موقع ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

موضوع اور مباحث

اس موقع پر کفار مکہ کی فہمائش اور تنبیہ کے لیے جو خطبہ نبی ﷺ پر نازل فرمایا گیا اس کی تمہید چند اہم مباحث پر مشتمل ہے:

اول یہ کہ تم لوگ اس قرآن کو محمد ﷺ کی تصنیف سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو۔ یہ کتاب تو اپنی ذات میں خود اس امر کی بین شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوند عالم کی کتاب ہے۔

دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں بھی غلطی کر رہے ہو۔ تمہارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہوگئی ہے۔ حالانکہ در حقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر تمہارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

تیسرے یہ کہ تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے۔

حالانکہ اس رسول کی بعثت اور اس کتاب کی تنزیل اس ساعت خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انہیں بدل ڈالے، نہ وہ کسی جہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو۔ وہ تو اس فرمانروائے کائنات کے پختہ اور اٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع وعلیم اور حکیم ہے۔ ان سے لڑنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ اللہ کو خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے باوجود تمہیں دوسروں کو معبود بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمہارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص شعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی و موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہوسکتا کہ معبود ہونے کے مستحق اس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کر کے اسی کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ۔ حقیقت میں تو ان کا رب بھی اکیلا وہی خدا تھا جو تمہارا رب ہے، اور انہیں بھی اسی ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمہیں کرنی چاہیے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی ربوبیت و رحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمہارا پیٹ پالے بلکہ یہ بھی ہے کہ تمہاری رہنمائی کا انتظام کرے۔ اسی رہنمائی کے لیے اس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اس قحط کے معاملے کو لیا گیا ہے جو اس وقت در پیش تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، یہ قحط نبی ﷺ کی استدعا پر آیا تھا، اور حضور ﷺ اس کے لیے دعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑجائیں گی، شاید کہ پھر حرف نصیحت ان پر کارگر ہو۔ یہ توقع اس وقت کسی حد تک پوری ہوتی نظر آ رہی تھی، کیونکہ بڑے بڑے ہیکڑ دشمنان حق کال کے مارے پکار اٹھے تھے کہ پروردگار، یہ عذاب ہم پر سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اس پر ایک طرف نبی ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے یہ لوگ کہاں سبق لینے والے ہیں، انہوں نے جب اس رسول کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کی زندگی سے، جس کے کردار سے اور جس کے کام اور کلام سے علانیہ ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے، تو اب محض ایک قحط ان کی غفلت کیسے دور کر دے گا۔ دوسری طرف کفار کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو کہ یہ عذاب تم پر سے ٹال دیا جائے تو تم ایمان لے آؤ گے۔ ہم اس عذاب کو ہٹائے دیتے ہیں، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں کتنے سچے ہو۔ تمہارے سر

پر تو شامت کھیل رہی ہے۔ تم ایک بڑی ضرب مانگ رہے ہو، ہلکی چوٹوں سے تمہارا دماغ درست نہیں ہوگا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کو بھی ٹھیک یہی آزمائش پیش آئی تھی جس سے اب کفار قریش کے سرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ ان کے پاس بھی ایسا ہی ایک معزز رسول آیا تھا۔ انہوں نے بھی وہ صریح علامات اور نشانیاں دیکھ لی تھیں جن سے اس کا مامور من اللہ ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بھی نشانی پر نشانی دیکھتے چلے گئے مگر اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ آخر کار رسول کی جان لینے کے درپے ہوگئے اور نتیجہ وہ کچھ دیکھا جو ہمیشہ کے لیے سامان عبرت بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا موضوع آخرت کا لیا گیا ہے جس سے کفار مکہ کو شدت کے ساتھ انکار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھ کر آتے نہیں دیکھا ہے، تم اگر دوسری زندگی کے دعوے میں سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس کے جواب میں عقیدہ آخرت کی دو دلیلیں مختصر طور پر دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس عقیدے کا انکار ہمیشہ اخلاق کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، بلکہ ایک حکیمانہ نظام ہے، اور حکیم کا کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ پھر کفار کے اس مطالبے کا کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ کام روز روز ہر ایک کے مطالبے پر نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے جب وہ تمام نوع انسانی بیک وقت جمع کرے گا اور اپنی عدالت میں ان کا محاسبہ فرمائے گا۔ اس وقت کی اگر کسی کو فکر کرنی ہو تو کرلے، کیونکہ وہاں کوئی نہ اپنے زور پر بچ سکے گا نہ کسی کے بچائے بچے گا۔

اللہ کی اس عدالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں مجرم قرار پائیں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جو وہاں سے کامیاب ہو کر نکلیں گے وہ کیا انعام پائیں گے۔ پھر یہ کہہ کر بات ختم کردی گئی ہے کہ تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ قرآن صاف سیدھی زبان میں اور تمہاری اپنی زبان میں نازل کردیا گیا ہے، اب اگر تم سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور انجام بدی دیکھنے پر مصر ہو تو انتظار کرو، ہمارا نبی بھی منتظر ہے، جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت پر سامنے آجائے گا۔

رکوعاتہا 3

44 سُوۡرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ 64

اٰیاتہا 59

حٰمٓ ﴿۱﴾

ح م

وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾

قسم ہے اِس کتاب مبین کی

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ‏ (۳)
کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے[1]۔

(۱) ۔ کتاب مبین کی قسم کھانے کا مطلب سورۃ زخرف حاشیہ نمبر ۱ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی قسم جس بات پر کھائی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد ﷺ نہیں ہیں بلکہ " ہم " ہیں، اور اس کا ثبوت کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، خود یہ کتاب ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد مزید بات یہ فرمائی گئی کہ وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی جس میں اسے نازل کیا گیا۔ یعنی نادان لوگ، جنہیں اپنی بھلائی برائی کا شعور نہیں ہے، اس کتاب کی آمد کو اپنے لیے بلائے ناگہانی سمجھ رہے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن در حقیقت ان کے لیے اور تمام نوع انسانی کے لیے وہ ساعت بڑی سعید تھی جب " ہم " نے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے یہ کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات میں قرآن نازل کرنے کا مطلب بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ نزول قرآن کا سلسلہ اس رات شروع ہوا اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآن ام الکتاب سے منتقل کر کے حامل وحی فرشتوں کے حوالے کردیا گیا اور پھر وہ حالات و وقائع کے مطابق حسب ضرورت نبی ﷺ پر ۲۳ سال تک نازل کیا جاتا رہا۔ صحیح صورت معاملہ کیا ہے، اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورۃ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا کہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ، اور یہاں فرمایا کہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ پھر یہ بات بھی قرآن مجید ہی میں بتادی گئی ہے کہ وہ ماہ رمضان کی ایک رات تھی شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ (البقرہ، ۱۸۵)۔

فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍۙ‏ (۴)
یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ[2] ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے[3]۔

(۲) ۔ اصل میں لفظ " اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ " استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ حکم سراسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کسی غلطی یا خامی کا اس میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

(۳) ۔ سورۃ قدر میں یہی مضمون اس طرح بیان کیا گیا ہے تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ‌ۚ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ ، " اس رات ملائکہ اور جبریل اپنے رب کے اذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اترتے ہیں " ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شاہی نظم و نسق میں یہ ایک ایسی رات ہے جس میں وہ افراد اور

قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالے کردیتا ہے۔ اور پھر وہ انہی فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ بعض مفسرین کو جن میں حضرت عکرمہ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، یہ شبہ لاحق ہوا ہے کہ یہ نصف شعبان کی رات ہے، کیونکہ بعض احادیث میں اسی رات کے متعلق یہ بات منقول ہوئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ لیکن ابن عباس، ابن عمر، مجاہد، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، ابن زید، ابو مالک، ضحاک اور دوسرے بہت سے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رمضان کی وہی رات ہے جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے، اس لیے کہ قرآن مجید خود اس کی تصریح کر رہا ہے، اور جہاں قرآن کی صراحت موجود ہو وہاں اخبار آحاد کی بنا پر کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ " عثمان بن محمد کی جو روایت امام زہری نے شعبان سے شعبان تک قسمتوں کے فیصلے ہونے کے متعلق نقل کی ہے وہ ایک مرسل روایت ہے، اور ایسی روایات نصوص کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتیں" ۔ قاضی ابوبکر ابن العربی کہتے ہیں کہ " نصف شعبان کی رات کے متعلق کوئی حدیث قابل اعتماد نہیں ہے، نہ اس کی فضیلت کے بارے میں اور نہ اس امر میں کہ اس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ لٰذا ان کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے" (احکام القرآن)

اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَاؕ-اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَۚ(۵)
ہم ایک رسول، بھیجنے والے تھے،

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَؕ-اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُۙ(۶)
تیرے رب کی رحمت کے طور پر (۴) ۔ یقینا وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے، (۵)

(۴) ۔ یعنی یہ کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجنا نہ صرف حکمت کا تقاضا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی تھا، کیونکہ وہ رب ہے اور ربوبیت صرف اسی بات کی متقاضی نہیں ہے کہ بندوں کے جسم کی پرورش کا سامان کیا جائے اور انہیں تاریکی میں بھٹکتا نہ چھوڑ دیا جائے۔

(۵) ۔ اس سیاق وسباق میں اللہ تعالیٰ کی ان دو صفت کو بیان کرنے سے مقصود لوگوں کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ صحیح علم صرف وہی دے سکتا ہے، کیونکہ تمام حقائق کو وہی جانتا ہے۔ ایک انسان تو کیا، سارے انسان مل کر بھی اگر اپنے لیے کوئی راہ حیات متعین کریں تو اس کے حق ہونے کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ پوری نوع انسانی یکجار ہو کر بھی ایک سمیع وعلیم نہیں بنتی۔ اس کے بس میں یہ ہے ہی نہیں کہ ان تمام حقائق کا احاطہ کرے جن کا جاننا ایک صحیح راہ حیات متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہی سمیع وعلیم ہے، اس لیے وہی یہ بتاسکتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا، حق کیا ہے اور باطل کیا، خیر کیا ہے اور شر کیا۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَاۘ-اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ(۷)

آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو (۶) ۔

(۶) ۔ اہل عرب خود اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب (مالک و پروردگار) ہے۔ اس لیے ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم بےسوچے سمجھے محض زبان ہی سے یہ اقرار نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمہیں واقعی اس کی پروردگاری کا شعور اور اس کے مالک ہونے کا یقین ہے، تو تمہیں تسلیم کرنا چاہیے کہ (1) انسان کی رہنمائی کے لیے کتاب اور رسول کا بھیجنا اس کی شان رحمت و پروردگاری کا عین تقاضا ہے، اور (2) مالک ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا حق اور مملوک ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا فرض ہے کہ اس کی طرف سے جو ہدایت آئے اسے مانو اور جو حکم آئے اس کے آگے سر اطاعت جھکا دو۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ‌ؕ-رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآىٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ(۸)

کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے (۷) ۔ وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے (۸) ۔ تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں (۹) ۔

(۷) ۔ معبود سے مراد ہے حقیقی معبود جس کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت (بندگی و پرستش) کی جائے۔

(۸) ۔ یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ جس نے بےجان مادوں میں جان ڈال کر تم کو جیتا جاگتا انسان بنایا، اور جو اس امر کے کلی اختیارات رکھتا ہے کہ جب تک چاہے تمہاری اس زندگی کو باقی رکھے اور جب چاہے اسے ختم کر دے، اس کی تم بندگی نہ کرو، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرو، یا اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کرنے لگو۔

(۹) ۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمہارے جن اسلاف نے اس کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنائے، ان کا رب بھی حقیقت میں وہی تھا۔ انہوں نے اپنے اصلی رب کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے کوئی صحیح کام نہ کیا تھا کہ ان کی تقلید کرنے میں تم حق بجانب ہو اور ان کے فعل کو اپنے مذہب کے درست ہونے کی دلیل ٹھہرا سکو۔ ان کو لازم تھا کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرتے کیونکہ وہی ان کا رب تھا۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو تمہیں لازم ہے کہ سب کی بندگی چھوڑ کر اسی ایک کی بندگی اختیار کرو کیونکہ وہی تمہارا رب ہے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ(۹)

(مگر فی الواقع ان لوگوں کو یقین نہیں ہے) بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں (۱۰) ۔

(۱۰) ۔ اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دہریے ہوں یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساعتیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو اس میں کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دہریہ اپنے انکار خدا میں بظاہر خواہ کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گزرتا ہے کہ خاک کے ایک ذرے سے لے کر کہکشانوں تک اور گھاس کی ایک پتی سے لے کر انسان کی تخلیق تک یہ حیرت انگیز، حکمت سے لبریز نظام کسی صانع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اسی طرح ایک مشرک اپنے شرک میں خواہ کتنا ہی گہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی نہ کبھی اس کا دل بھی یہ پکار اٹھتا ہے کہ جنہیں میں معبود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہوجائے، نہ یہی ہوتا ہے کہ انہیں اپنے شرک اور اپنی دہریت میں کامل یقین و اطمینان حاصل رہے۔ اس کے بجائے ان کا دین در حقیقت شک پر قائم ہوتا ہے خواہ اس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ شک ان کے اندر بےچینی کیوں نہیں پیدا کرتا، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ یقین کی اطمینان بخش بنیاد انہیں مل سکے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے جس کی فکر میں وہ اپنے دل اور دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح، ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے جن پر سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی وہ غور و فکر میں صرف نہیں کرسکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں۔ انکار و دہریت کی بحثیں ہیں تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِى السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ(۱۰)
اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا

يَّغْشَى النَّاسَؕ-هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ(۱۱)
اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ(۱۲)
(اب کہتے ہیں کہ) " پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں ۔"

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَ قَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ(۱۳)
ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے ؟ ان کا حال تو یہ ہے کہ ان کے پاس رسول مبین آگیا [۱۱] ۔

(۱۱) رسول مبین کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا رسول ہونا اس کی سیرت، اس کے اخلاق و کردار اور اس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ(۱۴)

پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ " یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے" (۱۲)

(۱۲) ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ بےچارہ تو سیدھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اسے بھروں پر چڑھا لیا، وہ در پر وہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے انہیں پیش کردیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ ان ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اڑا دیتے تھے جو رسول اللہ برسوں سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھک جا رہے تھے، وہ نہ ان معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے۔ اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہ اور ابوبکر اور علی اور زید بن حارثؓ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضور کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ درپردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲)۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ(۱۵)

ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى-اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ(۱۶)

جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔ (۱۳)

(۱۳) ان آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اور یہ اختلاف صحابہ کرام کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کے مشہور شاگرد مسروق کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفہ کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت يَوْمَ تَأْتِى السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ پڑھی، پھر کہنے لگا، جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے ؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا

بہرا کر دے گا، مگر اہل ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہوگیا ہو۔ اس کی یہ بات سن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہ لیٹے ہوئے تھے، یہ تفسیر سن کر گھبرا کے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضور نے دعا کی کہ خدایا یوسف ؑ کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چناچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھا گئے۔ اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابو سفیان نے آ کر حضور سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعہ کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ روایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ مسروق سے نقل کی ہے۔ اور مسروق کے علاوہ ابراہیم نخعی، قتادہ، عاصم اور عامر کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے اس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی اس لیے اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرت موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قتادہ، ابو العالیہ، مقاتل، ابراہیم النخعی، ضحاک اور عطیہ العوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔ دوسری طرف حضرت علی، ابن عمر، ابن عباس، ابو سعید خدری، زید بن علی اور حسن بصری جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اس تفسیر کو ان روایات سے ملتی ہے جو خود نبی ﷺ سے منقول ہیں۔ حذیفہ بن اسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضور برآمد ہوئے اور فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہو لیں گی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دھواں، دابہ، یاجوج و ماجوج کا خروج، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرہ العرب میں، اور عدن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی (مسلم)۔ اسی کی تائید ابو مالک اشعری کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابن جریر اور طبرانی نے نقل کیا ہے، اور ابو سعید خدری کی روایت جسے ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے دھوئیں کو علامات قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضور نے فرمایا ہے کہ و دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہوگا، اور کافر کی نس نس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر منفذ سے نکلے گا۔

ان دونوں تفسیروں کا تعارض اوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی تفسیر کا تعلق ہے، ی

امر واقعہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں حضور ﷺ کی دعا سے سخت قحط رونما ہوا تھا جس سے کفارکے خنّے بہت کچھ ڈھیلے پڑگئے تھے، اور انہوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضور ﷺ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اس واقعہ کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، الانعام، حاشیہ ۲۹، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۷۷، یونس، حواشی ۱۴۔ ۱۵۔ ۲۹، جلد سوم، المومنون حاشیہ ۷۲)۔ ان آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اسی صورت حال کی طرف ہے۔ کفار کا یہ کہنا کہ " پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں "، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ " ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے جبکہ رسول مبین آ گیا، پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔ " پھر یہ فرمانا کہ " ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ " یہ ساری باتیں اسی صورت میں راست آسکتی ہیں جبکہ واقعہ حضور ﷺ ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اطلاق بعید از فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابن مسعود ؓ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ حصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ " دھواں " بھی اسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا، یہ بات نہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آگیا اور لوگوں پر چھا گیا؟ وہاں تو کہا گیا ہے کہ " اچھا تو اس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ " بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمہیں کی گئی ہے اس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت کا انتظار کرو، اس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حق کیا تھا۔ پس جہاں تک دھوئیں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علامات قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرین کبار میں سے جنہوں نے حضرت ابن مسعود ؓ کی تائید کی انہوں نے پوری بات کی تائید کردی، اور جنہوں نے ان کی تردید کی انہوں نے پوری بات کی تردید کردی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا کونسا حصہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ(۱۷)

ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ ان کے پاس ایک نہایت شریف رسول [۱۴] آیا

(۱۴) ؎ اصل میں " رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابل تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ-اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۱۸
اور اس نے کہا (۱۵) " اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو (۱۶) ، میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں (۱۷) ۔

(۱۵) ۔ یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سالہا سال کے دوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انہوں نے فرعون اور اس کے اہل دربار سے کہی تھیں ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۳تا ۹۷، یونس، حواشی، ۷۲ تا ۹۳ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۸ الف تا ۵۲، الشعراء، حواشی ۷تا ۴۹، النمل، حواشی ۸تا ۱۷، القصص، حواشی ۴۶تا ۵۶،۔ جلد چہارم، المومن، آیات ۲۳ تا ۴۶۔ الزخرف ۴۶تا ۵۶مع حواشی) ۔

(۱۶) ۔ اصل میں اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللِّہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اوپر ہم نے کیا ہے اور اس کے لحاظ سے یہ اس مطالبہ کا ہم معنی ہے جو سورۂ اعراف (آیت ۱۰۵) ، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشعراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ " بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو " دوسرا تر جمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے، یہ ہے کہ " اللہ کے بندو میرا حق ادا کرو " یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمہارے اوپر میرا حق ہے۔ بعد کا یہ فقرہ کہ " میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں " اس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

(۱۷) ۔ یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کرسکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے وہی بےکم وکاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی)۔

وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰہِ-اِنِّیْٓ اٰتِیْکُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (۱۹
اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی صریح سند پیش کرتا ہوں (۱۸) ۔

(۱۸) ۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور میں اسی کے رسول کی حیثیت سے انہیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں اس میں شک ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمہارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اس سند سے مراد کوئی

ایک معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیام تک حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو سالہا سال تک دکھاتے رہے، جس سند کو بھی ان لوگوں نے جھٹلایا اس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزخرف حواشی نمبر ۴۲۔۴۳)۔

وَ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ۝(۲۰)
اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔

وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ(۲۱)
اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو "[۱۹] ۔

(۱۹) ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اڑا ہوا تھا مگر یہ دیکھ کر کے ان نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں پہلے تو اس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۃ زخرف، آیات ۵۱ ۔۵۳میں گزر چکی ہے (ملاحظہ ہو حواشی سورۃ زخرف ۴۵ تا ۴۹) پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخر کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کردینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس وقت آنجناب نے وہ بات کہی جو سورۃ مومن، آیت ۲۷میں گزر چکی ہے کہ اِنّی عذت بربّی وربکُم مِن کُل مُتکبرٍ لّا یؤمن بیوم الحساب۔ " میں نے پناہ لی اپنے رب کی ہر اس متکبر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا "۔ یہاں حضرت موسیٰ اپنی اسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اعیان سلطان سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمہارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ رب العالمین سے پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو، میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اس کا بہت برا انجام دیکھو گے۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ(۲۲)
آخرکار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں [۲۰] ۔

(۲۰) ۔ یہ حضرت موسیٰ کی آخری رپورٹ ہے جو انہوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی ہے " یہ لوگ مجرم ہیں " یعنی ان کا مجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہوچکا ہے۔ کوئی گنجائش ان کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاح حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ فرمائیں۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ(۲۳)
(جواب دیا گیا) اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو [۲۱] لے کر چل پڑ تم لوگوں کا پیچھا کیا [۲۲] جائے گا۔

(۲۱) ۔ یعنی ان سب لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں ان میں بنی اسرائیل بھی تھے اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسف ؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰ ؑ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہوچکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنہوں نے حضرت موسیٰ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اہل مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یوسف، حاشیہ ۶۸) ۔

(۲۲) ۔ یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰ ؑ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳، الشعراء، حواشی ۳۹ تا ۴۷)

وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًاؕ-اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ(۲۴)
سمندر کو اس کے حال پر کھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔" (۲۳)

(۲۳) ۔ یہ حکم اس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰ ؑ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار کرچکے تھے اور چاہتے تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اسے پھر ویسا ہی کردیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اس کا لشکر اس راستے سے گذر کر نہ آجائے جو معجزے سے بنا تھا۔ اس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو، اسے اسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اس راستے میں اتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائے گا اور یہ پوری فوج غرق کردی جائے گی۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ(۲۵)
کتنے ہی باغ اور چشمے

وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ(۲۶)
اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔

وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ(۲۷)
کتنے ہی عیش کے سر و سامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے۔

كَذٰلِكَ-وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ(۲۸)
ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنادیا (۲۴) ۔

(۲۴) ۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنادیا۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آل فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور وہاں اس زمین کے

وارث ہوئے ہوں یہی اختلاف بعد کے مفسرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۵)

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۲۹)
پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین [۲۵] ، اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔

(۲۵) ۔ یعنی جب وہ حکمران تھے تو ان کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ان کی حمد وثناء کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی، خوش آمدیوں کے جم گھٹے انکے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے۔ ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالم ان کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیر بار ہے۔ اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں، مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہیں تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے نہ خلق خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مشیت الٰہی سے اس کی رسی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گذر گئے تو اس طرح اٹھا کر پھینک دیئے جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۳۰)
اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب، فرعون [۲۶] سے نجات دی

(۲۶) ۔ یعنی فرعون بجائے خود کے لیے ذلت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذاب مجسم کے شاخسانے تھے۔

مِنْ فِرْعَوْنَ-اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (۳۱)
جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا [۲۷]،

(۲۷) ۔ اس میں ایک لطیف طنز ہے کفار قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حد بندگی سے تجاوز کرنے والوں میں تمہارا مرتبہ اور مقام ہی کیا ہے۔ بڑے اونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تحت خدائی کا روپ دھارے بیٹھا تھا۔ اسے جب خس و خاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمہاری کیا ہستی ہے کہ قہر الٰہی کے آگے ٹھہر سکو۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۳۲)
اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی [۲۸] ،

(۲۸) ۔ یعنی بنی اسرائیل کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں اللہ پر عیاں تھیں اس نے بے دیکھے بھالے اس کا انتخاب اندھا دھند نہیں کرلیا تھا۔ اس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں ان میں سے اس قوم کو جب اس نے اپنے پیغام کا

حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا علمبردار بنانے کے لیے چنا تو اس بنا پر چنا
کہ اس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے یہی اس کے لیے موزوں
تر تھی۔

وَ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ(۳۳)
اور انھیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی [۲۹] ۔

(۲۹) ۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، البقرہ، حواشی ۶۴تا
۸۵، النساء، حواشی ۱۸۲ تا ۱۹۹، المائدہ، حواشی ۴۲تا ۴۷، جلد دوم الاعراف،
حواشی ۹۷تا ۱۳۲، جلد سوم، طہٰ، حواشی ۵۶ تا ۷۴۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَیَقُوْلُوْنَ(۳۴)
یہ لوگ کہتے ہیں

اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰی وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ(۳۵)
ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے
والے نہیں ہیں [۳۰] ۔

(۳۰) ۔ یعنی پہلی دفعہ ہم مریں گے تو بس فنا ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پھر
کوئی زندگی نہیں ہے۔ " پہلی موت " اس کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ
اس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص
کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں
ہوتا کہ اس کے بعد لازم دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ
اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔

فَاْتُوْا بِاٰبَآىٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ(۳۶)
اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو [۳۱] ۔

(۳۱) ۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی
اٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی
دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی
ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعد موت کا
یقین آجائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بےبنیاد
ہے۔ یہ گویا ان کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔
حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے
دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے ؟ اور نبی ﷺ یا کسی مسلمان
نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں ؟

اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ-وَّ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْؕ-اَهْلَكْنٰهُمْ٘-اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ(۳۷)
یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم [۳۲] اور اس سے پہلے کے لوگ ؟ ہم نے ان کو
اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہوگئے تھے [۳۳] ۔

(۳۲) ۔ تبع قبیلہ حمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کسریٰ ، قیصر، فرعون وغیرہ القاب مختلف ممالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ یہ لوگ قوم سبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے ۱۱۵ قبل مسیح میں ان کو سبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ عیسیوی تک یہ حکمراں رہے۔ عرب میں صدیوں تک ان کی عظمت کے افسانے زبان زد خلائق رہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، سورۃ سبا، ۳۷) ۔

(۳۳) ۔ یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکار آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریہ کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ " یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ "؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفار مکہ تو اس خوش حالی و شوکت و حشمت کو پہنچ ہی نہیں سکے ہیں جو تبع کی قوم، اور اس سے پہلے سبا اور قوم فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیاوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے ان کو کب بچا سکتی تھی۔ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر بچ جائیں گے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، سورۃ سباء، حواشی نمبر ۲۵۔ ۳۶)

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ(۳۸)
یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں۔

مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ(۳۹)
ان کو ہم نے بر حق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں [۳۴] ۔

(۳۴) ۔ یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اس کارخانہ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اسی بناء پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رل مل جائے گا اور اس کے کسی اچھے یا برے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالق حکیم کی بنائی ہوئی ہے اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ فعل عبث کا ارتکاب کرے گا۔ انکار آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، ہم اس کی مفصل تشریح کرچکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد، اول، الانعام، حاشیہ ۴۶، جلد دوم، یونس، حواشی ۱۰۔ ۱۱، جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۶۔ ۱۷، المومنون، حواشی ۱۰۱۔ ۱۰۲، الروم، حواشی ۴تا ۱۰)۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَۙ(۴۰)
ان سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے [۳۵] ،

(۳۵) ۔ یہ ان کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ " اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر
تم سچے ہو "۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی بعد موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ
جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مردہ قبرستان سے اٹھا کر اس کے
سامنے لا کھڑا کیا جائے اس کے لیے تو رب العالمین نے ایک وقت مقرر کردیا ہے
جب تمام اولین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے
گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام
بہرحال اپنے وقت مقرر پر ہی ہوگا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے،
کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اس عدالت سے کامیاب نکلنے کی
تیاری کرسکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری
عمر اس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ برائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس
اسی دنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے
جس میں ہمارے اچھے یا برے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْــًٔـا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ(۴۱)
وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب [۳۶] کے کچھ بھی کام نہ
آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی

اصل میں لفظ " مولیٰ " استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص
کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے،
قطع نظر اس سے کہ وہ رشتے داری کا تعلق ہو یا دوستی کا یا کسی اور
قسم کا۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ-اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ(۴۲)
سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے
۔ [۳۷]

(۳۷) ۔ ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی
اس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا
سکے گی، نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کلی اختیارات اس حاکم
حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت
روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتا کسی میں
نہیں ہے۔ یہ بالکل اس کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم
فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اس کی شان یہی
ہے کہ انصاف کرنے میں بےرحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن
جس کے مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ بہرحال بےکم وکاست نافذ
ہوگا۔ عدالت الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں
بتایا گیا ہے کہ اس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا
ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے
ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا
جائے گا۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ (۴۳)
زقوم [۳۸] کا درخت

(۳۸) ۔ زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۃ صافات، حاشیہ ۳۴۔

طَعَامُ الْاَثِيْمِ (۴۴)
گناہ گاروں کا کھانا ہوگا،

كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِى الْبُطُوْنِ (۴۵)
پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا

كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ (۴۶)
جیسے تیل کی تچھلٹ جیسا کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے [۳۹] ۔

(۳۹) ۔ اصل میں لفظ " المُهل " استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں پگھلی ہوئی دھات، پیپ لہو، پگھلا ہوا تارکول لاوا تیل کی تلچھٹ یہ مختلف معنی اہل لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں لیکن اگر زقوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تلچھٹ سے مشابہ ہوگا۔

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ (۴۷)
پکڑو اسے اور گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ

ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ (۴۸)
اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (۴۹)
چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ (۵۰)
یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔"

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ (۵۱)
خدا ترس لوگ امن کی جگہ [۴۰] میں ہوں گے ۔

(۴۰) ۔ امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مشقت اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا، " اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہوگے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے،

ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہوگے " (مسلم بروایت ابوہریرہ و ابو سعید خدری)۔

فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ(۵۲)
باغوں اور چشموں میں ،

یَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ(۵۳)
حریر و دیبا [۴۱] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۔

(۴۱) ۔ اصل میں سُنْدُس اور اِسْتَبْرَق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سُندس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ اور استبرَق فارسی لفظ ستبر کا معرب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

كَذٰلِكَ-• وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ(۵۴)
یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں [۴۲] ان سے بیاہ دیں گے ،

(۴۲) ۔ اصل الفاظ ہیں حُوْرٌ عِیْنٌ۔ حور جمع ہے حوراء کی اور حوراء عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ اور عین جمع ہے عیناء کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، الصافات، حاشیہ ۲۶و ۲۹)۔

یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ(۵۵)
وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے [۴۳]

(۴۳) ۔ " اطمینان سے " طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں گے بےفکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کردی جائے گی۔ دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو درکنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اس اطمینان سے طلب نہیں کرسکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا، کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال کرتا ہے اس کی قیمت بہرحال اس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے۔ جنت میں مال اللہ کا ہوگا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہوگی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہوجانے کا خطرہ ہوگا نہ بعد میں بل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى-وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ(۵۶)
وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا دے گا [۴۴]

(۴۴) ۔ اس آیت میں دو باتیں قابل توجہ ہیں ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنم سے بچائے جانے کا ذکر خاص طور پر الگ فرمایا گیا ہے، حالانکہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ

جہنم میں جانے سے بچ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرمانبرداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہوسکتی ہے جبکہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس برے انجام سے بچ گیا ہے۔ دوسری قابل توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو، اگرچہ آدمی کو انعام اس کے اپنے حسن عمل ہی پر ملے گا، لیکن اول تو حسن عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہوسکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آسکتا ہے وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہوسکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جاسکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اس کی خدمات کو قبول فرمالے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوت بازو سے جنت جیت لینے کا دعوٰی کرسکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا اعملوا و سددوا وقاربوا و اعلموا انّ احداً لن یُّدخلہ عملہ الجنۃ" عمل کرو اور اپنی حد استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کر دے گا" لوگوں نے عرض کیا " یا رسول اللہ، کیا آپ کا عمل بھی " ؟ فرمایا وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یتغمّدنی اللہ بِرَحْمَتِہٖ، " ہاں میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤں گا الّا یہ کہ مجھے میرا رب اپنی رحمت سے ڈھانک لے "۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَؕ-ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ(۵۷)

یہ خاص تیرے رب کے فضل سے ہوگا اور یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ(۵۸)

اے نبی، ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنادیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ(۵۹)

اب تم بھی انتظار کرو یہ بھی منتظر ہیں (۴۵)

(۴۵) ۔ یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے، اور یہ بھی منتظر ہیں کہ دیکھیں تمہاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔